SPCRD GLOBAL PUBLISHING

Journal of Languages, Culture and Civilization

Volume 5, Issue 2, June 2023, Pages: 195-205

Homepage: http: jlcc.spcrd.org **ISSN(P):** 2708-3748

Social Values in Muhammad Hameed Shahid's Fiction: An Analytical Study

Muhammad Shahbaz Akmal [a], Amin Munawar [b], Imtiaz Hussain Baloch [c], Anna Mariam [d]

[a] M. Phil Scholar, Department of Urdu, Institute of Southern Punjab, Multan.
[b] Assistant Professor, Department of Urdu, Institute of Southern Punjab, Multan.
[c] Chairman, Department of Urdu, Institute of Southern Punjab, Multan.
[d] M. Phil Scholar, Department of Urdu, Institute of Southern Punjab, Multan.

Corresponding author's email: bhuttadoit@gmail.com

Received: 28 May 2023 **Published:** 30 June 2023

Abstract

Muhammad Hameed Shahid is a unique fiction writer. He looks at the common people of the society with the eyes of the heart. This article attempts to analyze his short stories in the perspective of social values. He has chosen a very simple and natural technique to reveal the social truth that he has decided to describe. The beauty of his fiction is that the reader feels himself a part or character of his fiction. His main attitude in his stories is to look into the depths of the individual is existence. He seems to search for the motives of human actions in the darkness of the unconscious. He has taken a tour of the human heart. The journey from outer to the inner can only be made by an observant fiction writer and he has portrayed emotions by harmonizing external condition with his internal conditions in such a way that his story feels like everyone's story.

Keywords

Social Values, Muhammad Hameed Shahid, Short Stories, Analysis, Urdu, Myths.

DOI Number: 10.47067/jlcc.v5i2.178

© 2023 The authors. Published by SPCRD Global publishing. This is an open access article under the Creative Commons Attributions-NonCommercial 4.0

کسی بھی ادیب کی اس سے بڑی خوش بختی کیا ہو سکتی ہے کہ اُسے زندگی میں ہی وہ شہرت و مقبولیت حاصل ہو جائے جس کا وہ حقدار ہے ایسی شخصیات اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ان گم نام ناموں میں ایک نام محمد حمید شاہد کا ہے ۔کسی بھی ادیب کی تعینِ قدرکے سلسلے میں اہم کردار اس کی ادبی تخلیقات کا ہوتا ہے۔ کہ فن کار اپنی تخلیقی کاوشوں کے حوالے سے کس مقام و مرتبہ کا حامل ہے۔محمد حمید شاہد ان خوش نصیب افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جنہیں قابل رشک حد تک مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ایک تخلیق کار کی کاوشوں کا بیشتر مدار معاشرے پر ہوتا ہے ۔جہاں سے فنکار حسب استعداد کہانی کے لیے مواد حاصل کرتا ہے ۔معاشرے کی ادبی ،سماجی ،سیاسی و معاشرتی صورت حال ،محرکات و عوامل کہانی میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں ادب خلا میں تخلیق نہیں ہو جاتا اس کے لیئے مناظر فطرت کے ساتھ ساتھ اپنے اطراف و اکناف کا مطالعہ و مشاہدہ درکار ہوتا ہے یہی وہ اوصاف ہیں جن سے متصف ہو کر ایک عام انسان عمومی زندگی سے بالاتر ہو کر اپنا اختصاص قائم کرتا ہے اور خود کو منفرد ممتاز بناتا ہے۔حمید شاہد کا کما ل یہی ہے کہ انہوں نے اپنے معاصر ادبی منظر نامہ سے کما حقہ استفادہ کرتے ہوئے اپنے لیئے جداگانہ راہوں کا انتخاب کیا جن راہوں پر چلتے ہوئے انہیں شہرت حاصل ہوئی ہے۔

بیسویں صدی میں روس کو افغانستان سے شکست پا ہو کر لوٹنا پڑا تو اس وقت دنیا پر ایک ہی سپر پاورابھر کر سامنے آئی اور اس کے ساتھ ہی دنیا کا نقشہ تیزی سے تبدیل ہوتا گیا ۔دنیا کے اصول و ضوابط اور معیار بھی تغیر پذیری کا شکار ہوئے تبدیلی کی اس لہر میں معاشرتی اقدار بھی شدید دباؤ میں آئیں اور کئی مقامات پر معاشرتی اقدار کی عمارت منہدم ہو گئی ۔محمد حمید شاہد نے انھی معاشرتی اقدار کے انہدم کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے نائن الیون کے تناظر میں لکھے گئے افسانے اس کی زندہ مثال ہیں ۔اسی طرح کچھ افسانوں میں دونسلوں کے درمیان سوچنے اور سمجھنے کے مختلف اور بدلتے ہوئے رنگ دکھائے گئے ہیں اسی طرح جدید تر زندگی کے تقاضوں نے پرانی نسل کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے جبکہ نئی نسل بہت تیزی سے اپنے سفر پر گامزن ہے۔

افسانہ "جنریشن گیپ " میں نئی اور پرانی نسل کے درمیان بڑھتے فاصلے کو موضوع بنایا گیا ہے پرانی نسل اپنی اقدار اور روایات سے منسلک نظر آتی ہے جب کہ نئی نسل جدید دور کے تقاضوں کے مطابق کامیابی کے اُفق پر پہنچنا چاہتی ہے پرانی نسل کے نمائندہ والدین ہیں جو اپنی گاؤں کی زندگی سے مطمئن

ہیں اس لیے کھیتوں سے محبت اور زمین میں اپنا وجود کاشت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں مصنف نے نئی زندگی کے کھوکھلے پن کو بے لباس کرنے کی کو شش کی ہے

افسانے سے ایک اقتباس :

"جو کچی دیواروں کے سائے میں ٹک کر نہ بیٹھ سکے اور پکے بنگلوں لمبی لمبی گاڑیوں کے سپنوں میں ایسا گم ہو جائے کہ اسے ماں باپ کے من کی پوٹ کھولنے کا خیا ل تک نہ رہے ---اس کےکھونٹے سے امید کا بیل نہ باندھ سکے" (۱)

افسانہ "بند آنکھوں سے پرے " کا موضوع محبت ہے اور محبت کے ساتھ ساتھ مرد اور عورت کے نفسیاتی پہلوؤں کا عکس بھی ملتا ہے یہ افسانہ حقیقی زندگی کی ایک بہترین تصویر پیش کرتا ہے اس افسانے میں لڑکی کی لڑکے سے محبت ،ایک بیوی کی اپنے خاوند سے محبت ،ایک چچا کی دولت کی چمک سے محبت اور ایک ناکام عاشق کی اپنی معشوق کے ساتھ محبت کی کہانی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔افسانے میں یونیورسٹی کی ایک بہت ہی ذہین طالبہ جو اپنی مثال آپ ہوتی ہے ۔اپنے ایک فیلو جمال کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے اس میں تیسرا کردار راحیل کا ہوتا ہے ایک دن راحیل حسینہ کو انتہائی بے بسی کے عالم میں جمال سے اقرار محبت کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے وہ حسینہ سے ہمدردی کرتا ہے ۔جمال حسینہ کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے ۔راحیل اُس سے شادی کا فیصلہ کر لیتا ہے ۔اور بہت خوشگوار زندگی گزار رہا ہوتا ہے کہ ایک دن جمال کی غیر متوقع آمد راحیل کے لیئے پریشانی کا باعث بن جاتی ہے ۔راحیل کو گمان ہوتا ہے۔کہ جمال کے دل میں آج بھی حسینہ موجود ہے راحیل کو اپنی بیٹی میں بھی حسینہ کا عکس نظر آتا ہے اس طرح کی نفسیاتی کشمکش افسانے کا حصہ ہے۔جوکہ ہمارے معاشرے کا عکاس ہے

اس افسانے میں رشتوں کو دولت کے لیے تلف ہوتے دکھایا گیا ہے جائیداد کی خاطر بھائی اپنےبھائی اور چچا اپنے ہی بھتیجے کو موت کی وادی میں لے جانے سے نہیں گبھراتا اس افسانے میں انسانی خود غرضی کو نشانہ بنایا گیا ہے ۔افسانے کے موضوع کے حوالے سے منشایاد لکھتے ہیں:

"بند آنکھوں سے پرے " محبت کی کہانی ہے لیکن اس میں انسانی زندگی کے بعض پوشیدہ نفسیاتی رویوں کا مطالعہ ملتا ہے " (۲)

افسانہ " ہار جیت " میں انسانی رشتوں کی بظاہر پختگی لیکن ناپائیداری اور ان کی شکست وریخت کو دکھایا گیا ہے اس افسانے میں گاؤں کی زندگی دکھائی گئی ہےاور معاشرتی ، سماجی رویوں پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔رشتوں کو اغراض کے ساتھ جوڑا گیا ہے جس کی بدولت آدم جیت کر بھی ہار جاتا ہے فیروز خان اکھاڑے میں ایک نامور پہلوان خانو کو زیر کرتا ہے مگر اپنے بڑے بھائی جس سے وہ بہت عزت کرتا ہے اس سے ہار جاتا ہے جو اس جیت کے بدلے زیبو کا رشتہ مانگ لیتا ہے حالانکہ زیبو فیروزخان کی محبت ہوتی ہے اور اس طرح وہ اپنے ہی بھائی کے ہاتھوں چت ہو جاتا ہے افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"فیروز خان چکرا کر گرا۔اسے لگا جیسے وہ چاروں شانے چت اکھاڑے میں پڑا تھا اور کوئی اس کی چھاتی پر گھٹنے گاڑے للکارے مار رہا تھا "۔(۳)

افسانہ ’’تماش بین‘‘مردوں کی سوچ کا نفسیاتی عکس ہے۔اس افسانے میں ایسےشخص کی کہانی کوبیان کیاگیا ہے جو عورت کو اپنے نفس کی لذت کشید کرنے کا ذریعہ سمجھتا ہے وہ عورت کے وجود کو تماشہ بنانے سے نہیں رکتا۔تماش بینوں کو مکمل آزادی ہوتی ہے کہ عورت کا نظارہ سر سے لیکر پاؤں تک کریں اور ٹکٹکی باندھ کر عورت کو دیکھتے رہیں۔

اس ضمن میں اقتباس ملاحظہ ہو۔

’’ہنستی مسکراتی۔تروتازہ چہروں والی لڑکیاں کسے اچھی نہیں لگتیں؟

مجھے بھی اچھی لگتی ہیں میں ذرا ہمت والا ہوں ان سے راہ رسم بڑھا لیتا ہوں کہ ان سے بات کر سکوں ان کی آنکھوں میں جھانک سکوں

اور ان کھنکتے قہقہوں کے پھولوں سے سماعت کی کارنس کو سجاؤں۔‘‘(٤)

اس کی کہانی کچھ یوں ہے کہ واحد متکلم ایک بنک ملازم ہے اور عورت اس کی کمزوری ہے اسی بنک کی ایک برانچ میں ڈاکہ پڑتا ہے اور ایک بنک ملازم شاہ نواز مارا جاتا ہے لیکن بنک کو ڈکیتی سے بچا لیتا ہے اس کی بیوہ واحد متکلم سے اپنے مرحوم شوہر کے واجبات کا چیک لینے بنک آتی ہے تو واحد متکلم اس کے حسن کا شکار ہو جاتا ہےاور اپنی نفسی لذت کے لیے اسے دوسرے روز پھر بلاتا ہے مگر اس رات وہ عورت شہر کے لوگوں کی بے حسی کا نشانہ بن جاتی ہے اسی بات کوڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی یوں بیان کرتے ہیں۔‘‘

> ’’تماش بین مردوں کے ایسے گروہ کی کہانی ہے جو عورت کے وجود اور حسن کو محض تماشا سمجھتا ہے سماج گر کی اوپری سطح پر لہروں کا تماشہ ساحل پر کھڑے کشتی کے ڈوبنے ابھرنے کا تماشا تماش بین کو اس سے کوئی علاقہ نہیں کہ اس سے تماشہ بننے والی عورت نے آخری بازی جیتی یا ہاری۔‘‘(۵)

"ماسٹر پیس" حمید شاہد کا پہلا افسانہ ہے جو کہ سیارہ ڈائجسٹ لاہور میں شائع ہوا اور بعد میں ان کے مجموعے’’بند آنکھوں سے پرے‘‘میں شامل ہوا اس افسانے میں ایک ایسے ادیب کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے جو افسانہ نگاری کو ترک کرکے تنقید کے میدان میں قسمت آزمانا چاہتا ہے۔اس افسانے میں ہماری ادبی قدرو قیمت کے سلسلے میں ہمارے مدیران کا اخلاقی زوال دکھایا گیا ہے فن کی نسبت اشتہارات اور پیسے کو زیادہ قدر دی جاتی ہے

افسانے کا مرکزی کردار ایک مصنف ہے جو تنقید کے میدان میں طبع آزمائی کرتا ہے اورا س کا ایک دوست ادبی پرچہ نکالنے کا ارادہ رکھتا ہے اور مصنف کومجبور کرتا ہے کہ ادبی پرچہ کیلئے ایک افسانہ لکھے۔اتنے اصرار کے بعد مصنف افسانہ لکھنے پر رضا مند ہوجاتا ہے وہ اس افسانے کو اپنا ایک شاہکار افسانہ بنانے کی کوشش کرتا ہے اس افسانے کا اختتام بہت اہم ہے یہی اسے باقی افسانوں سے منفرد کرتا ہے۔جب پرچہ شائع ہوتا ہے تو مصنف کو یہ دیکھ کر دکھ ہو تا ہے کہ افسانے کا آخری حصہ غائب ہوتا ہے اس کی جگہ ایک اشتہار لے لیتا ہے۔مصنف انتہائی دکھ کا شکار ہو جاتا ہے اور اس سے حاصل شدہ آمدنی اپنے دوست کے منہ پر مارتا ہے۔منشا یاد اس افسانے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ماسٹر پیس ایسے لوگوں کی ذہنیت کو پیش کرتی ہے جو
فن کو دولت کے ترازو میں تولنا چاہتے ہیں''(٦)

''وراثت میں ملنے والی نا کردہ نیکی''میں تہذیبی اقدار سے وابستگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔افسانے میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ نئی نسل اپنی اقدار سے بہت دور ہو گئی ہے پہلے لوگوں کی طبعیت میں شامل تھا کہ وہ دوسروں کے کام آئیں ان کاموں کی وجہ سے ان کو معاشرے میں اچھا مقام اور عزت بھی حاصل تھی۔اس عزت کو ہی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا تا ہم اب اس طرح کا سلسلہ رک سا گیا ہے افسانے کے مرکزی کردارکے بزرگوں کا تعلق ایک چھوٹے گاؤں سے ہوتا ہے لیکن دل کے سخی ہوتے ہیں۔اپنے اکلوتے بیٹے کی تعلیم اور بہترمستقبل کیلئے وہ شہر میں سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔لیکن پھر بھی ذہنی طور پر گاؤں سے وابستہ رہتے ہیں اس کا اظہار یوں کیا گیا ہے:

''اماں کہتی ہے،تمہارے ابا آنے کو شہر آ گئے تھے مگر
جب تک زندہ رہے ان کی روح گاؤں کی گرد آلود گلیوں
میں ہی بھٹکتی رہی۔''(٧)

مرکزی کردار کا والد گاؤں والوں سے وابستگی قائم رکھتا ہے اور ان کے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیتا ہے مگر ان کی وفات کے ساتھ ہی گاؤں سے وابستگی ختم ہو جاتی ہے کیونکہ بیٹا کاروباری مصروفیات کے باعث ایسا نہیں کر پاتا۔ گاؤں سےایک بوڑھا شخص اپنے بیٹے کی ملازمت کے سلسلے میں اس کے گھر آتا ہے۔مرکزی کردار کی بیٹی مصوری کے مقابلے میں شرکت کیلئے ایک پورٹریٹ کی تلاش میں ہوتی ہے وہ بوڑھے کو دیکھتے ہی اسے اس کیلئے موزوں سمجھتی ہے۔بوڑھا بھی راضی ہو جاتا ہے لڑکی کو پہلا انعام ملتا ہے۔مرکزی کردار عملی طور پر اس بوڑھے شخص کی مدد نہیں کر پاتا لیکن اتفاق سے بوڑھے شخص کے بیٹے کو اس کے وسیلے سے نوکری مل جاتی ہے۔

اصغر عابد اس افسانے کے حوالے سے یوں بیان کرتے ہیں:

------کرداروں کی عکاسی اتنی جاندار ہے کہ محسوس ہوتا
ہے جیسے سامنے دیکھ رہے ہوں۔''(٨)

افسانہ ''منجھلی''میں ایثار و قربانی کے جذبے کو نہایت ہی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے اولاد اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جب کوئی اپنا اس نعمت سے محروم

ہو تا ہے تو ایثار کی مثالیں قائم ہوتی ہیں۔یہی کہانی اس افسانے کی ہے۔یہ افسانہ دراصل حمید شاہد کی ہی زندگی کا ایک پہلو بیان کرتا ہے۔ان کی منجھلی بیٹی بڑے بھائی کے ہاں پرورش پاتی ہے۔کیونکہ حمید شاہد کے بڑے بھائی اولاد سے محروم ہوتے ہیں جب اپنی اولاد کو چاہے وہ بہت ہی قریبی کیوں نہ ہو رضاعت میں دنیا مشکل ہے۔اس صورت میں ماں باپ پر کیا گزرتی ہے وہ بیان کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی رقم طراز ہیں:

> ’’منجھلی لے پالک بچوں کی نفسیات سے مربوط موثر کہانی ہے۔ان بچوں کا مسئلہ انتہائی پیچیدہ ہے خاندانی اورسماجی مسئلہ ہے۔یہ بچے جہاں ایک خاندان کی محرومی دور کرتے ہیں وہاں اپنے والدین کی دائمی بے چینی کا سبب بھی بنتے ہیں‘‘۔(۹)

’’اللہ خیر کرے‘‘افسانے کا عنوان دیکھنے میں ایک دعائیہ کلمہ ہے مگر دراصل یہ ایک دعائیہ کلمہ نہیں ہے یہ کہانی محبت کی مثلث کو بیان کرتی ہے مگر یہ انسان کے لاشعور میں چھپی خباثت کو ظاہر کرتی ہے جس کا سامنا کرنے کی اس میں بھی ہمت نہیں ہوتی۔کہانی تین کرداروں کے گرد گھومتی ہے مرکزی کردار محسن کی بیوی کے ہاں بچے کی پیدائش ہونی ہوتی ہے تو اس کو ہسپتال لے جاتا ہے۔وہاں زیبو کو دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے جو نرس کے لباس میں اپنے فرائض اداکررہی ہوتی ہے۔جو کہ ماضی میں اس کی محبوبہ تھی اس کو دیکھتے ہی محسن کے اندر ماضی کی محبت انگڑائی لینا شروع کر دیتی ہے یہاں اس کی بے حس ہونے کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ماضی کی محبوبہ کو دیکھتے ہی آنے والے ننھے مہمان کی خوشی بھی اس کیلئے دکھ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔اور وہ اپنی خباثت کو چھپانے کیلئے ’’اللہ خیر کرے گا‘‘ کا ورد کرتا ہے۔

اگر آج کے انسانوں کا موازنہ گزرے زمانے کے انسانوں سے ہو تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آج کا انسان خلوص اور محبت کے جذبے سے محروم ہو چکا ہے۔یہ ایک انمول خزانہ تھا جو اجداد سے ملا تھا مگر مصروفیت،انا،اور خود پسندی کے بھنور میں کھو گیا ہے۔رشتے کی ڈور کمزور ہوتی جا رہی ہے۔اور معاشرہ سماجی لین دین کے سفر میں ہے اب انسان کی جان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔اور دوسروں کی جان لینا معمول بن گیا ہے۔پہلے کبھی کبھار انسانی قتل کی

خبر ملتی تھی لیکن عہد جدید میں ہمارے ٹی وی چینل کی روز مرہ کی بریکنگ نیوز بن چکی ہے۔پہلے پیسے کی فراوانی کم تھی مگر سکون تھا آج ہم سکون سے محروم ہو چکے ہیں اور نفسیاتی دباؤ کا شکار بن چکے ہیں۔

حمید شاہد کے ان افسانوں کو ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فرد اور معاشرہ کے درمیان رشتوں کی نوعیت تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے۔اسی لیے ذہنی تناؤ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔رشتوں کے مقابلے دولت اور اشیاء کی قیمت بڑھ گئی ہے۔خاندان بکھر رہے ہیں اور افراد کی تعداد نفسیاتی معالج کے پاس بڑھتی جا رہی ہے یہ ہمارے معاشرتی زوال کی نشانی ہے۔انسانی خصلت کے جتنے رنگ حمید شاہد نے اپنے افسانوں کا حصہ بنائے ہیں شاید ہی اس طرح انکے ہم عصرافسانہ نگارونمیں سے کسی افسانہ نگارکےافسانوں کا حصہ بنے ہوں۔

"دوسرا آدمی" کی کہانی انسانی نفسیات کی غمازی کرتی ہے یہ کہانی سادہ بیانیے کی رواں تحریر ہے ۔اس افسانے کی کہانی کچھ اس طرح ہے کہ ایک سرکاری ملازم اپنے دفتر سے کافی دور رہائش پذیر ہے ۔اس کی معاشی حالت اس کو اس بات پر آمادہ نہیں کرتی کہ وہ روزانہ دفتر جانے کے لیے اپنی ذاتی گاڑی کا استعمال کرے۔ اس لیے وہ پبلک ٹرانسپورٹ پر سفر کرنے پر مجبور ہوتا ہے ۔سرکاری ملازم جو کہ کہانی کا مرکزی کردار بھی ہے وہ کم گو اور اتنی جلدی کسی کے ساتھ گھل مِل جانے والا نہیں ہوتا ۔ایک دن دفتر سے گھر واپس آرہا ہوتا اور جس ویگن میں سوار ہوتا ہے اس میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر ایک بھاری بھر کم شخص سوار ہوتا ہے جو کہ باتونی قسم کا ہوتا ہے لیکن مرکزی کردار جو کہ کم گو ہوتا ہے اُسے یہ بندہ بالکل بھی پسند نہیں آرہا ہوتا اُس کے بار بار پوچھنے پر مرکزی کردار اپنا نام عاطف بتاتا ہے ۔وہ شخص اپنا نام بھی بغیر پوچھے ہاشم بتا دیتا ہے۔ہاشم ،عاطف کے ساتھ محو گفتگو ہونے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور اس سے زمانے کی بے حسی اور نفسا نفسی کا رونا روتا ہے وہ شخص عاطف کو اپنی بیوی کا ایک واقعہ بھی سناتا ہے جس میں وہ بتاتا ہے کہ عورت تو مرد سے بھی زیادہ سوشل ہوتی ہے ۔کیونکہ وہ جلد ہی دوست بنا لیتی ہے۔

> "دیکھیں نا جی عاطف صاحب! ایسا نفسا نفسی کا
> دور چلا ہے کہ کسی کو کسی کی پروا نہیں ۔"
> (۱۰)

عاطف اسکی بات سے اتفاق کر رہا ہوتا ہے اور اس کو یہ انسان اپنی سوچ کی وجہ سے پسند آ رہا ہوتا ہے وہ اس کی باتوں میں زیادہ دلچسپی لے کر سننے

لگتا ہے جب دونوں ایک سٹاپ پر اترتے ہیں تو عاطف مصافحہ کیے بغیر اپنی منزل کی طرف بڑھ جاتا ہے وہ شخص عاطف کو عجیب نفسیاتی کشمکش کا شکار کرکے آگے نکل جاتا ہے اور عاطف کے ذہین میں کئی سوالات چھوڑ جاتا ہےجو کہ اس کی بے چینی کی وجہ بنتے ہیں۔

"دوسرا آدمی ‘‘دراصل وہی ہم سفر ہوتا ہے جس کے سہارےمصنف نےبڑے ہی خوبصورت اور سادہ انداز میں زمانے کی نفسا نفسی کو بیان کیا ہے کچھ اِن جملوں سے زمانے کی بے قدری اور بے رخی کا اظہا ر کیا گیا ہے:

> "یہ عجب شہر ہے عاطف صاحب! اِدھر والا اُدھر والے کو جانتا نہیں آتے جاتے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں مگر نام تک نہیں پوچھتے ۔" (۱۱)

"سانس لینے میں درد ہوتا ہے " ایک ایسا افسانہ ہے جو زندگی کی حقیقتوں سے آشکار کرتا ہے۔ اس افسانے میں سانسوں کی ڈور کو ٹوٹتے ہوئے بھی دکھایا گیا ہے اور نئی ڈور کو جڑتے ہوئے بھی اصل میں یہ افسانہ ایک زندگی کی مختصر کہانی ہے اس کہانی میں بیٹے اور باپ جیسے دو لازوال رشتوں کو دکھایا گیا ہے جو محبت کی مثال ہے اور ماں کو موت کے مدمقابل کر کے نئی زندگی کا جنم دکھایا گیا ہے۔

اسکی کہانی کچھ یوں ہے کہ باپ بستر مرگ پر ہے بیٹا باپ سے ملنے جاتا ہے جسے دیکھ کر باپ کا چہرہ کھِل اٹھتا ہے لیکن اسکی زندگی کا سفر ختم ہو چکا ہوتا ہے اس لیے جان برلب نہیں ہوتا اور موت کی گہری وادی میں چلا جاتا ہے جہاں سے کبھی کوئی نہیں لوٹ سکا۔

اس افسانے میں ماں کے وجود سے نئے وجود کا جنم بھی تحریر کیا گیا ہے ماں ایک لازوال رشتہ ہے جس کی قیمت یا جس کا حق کوئی نہیں ادا ء کر سکتا اس افسانے میں ماں کو درد کی کیفیت میں دکھایا گیا ہے جو ایک وجود کو اس دنیا میں لانے کا سبب بن رہی ہے اس حالت کو مصنف نے بہت خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے:

> "ایک وجود کی کوکھ سے ایک اور زندہ وجود کا نکلنا ۔سہولت سے نہیں ،انگ انگ میں چھپے ہر درد کو جگا کر، بلکہ اس موت کے مقابل کرکے بھی، جو ایک نئی زندگی کے لیے پوری طرح تیار بدن پر کچو کے لگ کر اپنے آپ کو محسوس کراتی ہے، کتنا مشکل ہوتا ہے۔

"مشکل مگر زندگی سے بھر پور ۔" (۱۲)

اس افسانے میں ہمارے معاشرے کے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے جس میں ڈاکٹر ز اکثر نارمل ڈیلیوری کا بتا کر صرف پیسے بٹورنے کے لیے بعد میں کہتے ہیں کی نارمل ڈیلیوری کا ہونا ممکن نہیں ہے لہٰذا اب آپریشن کرنا ضروری ہے نہیں تو زچہ بچہ دونوں کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے ۔اور ساتھ ہی ایک کاغذ پر مریض کے گھر والوں کے دستخط بھی لے لیئے جاتے ہیں تاکہ ڈاکٹر خود کو ہر حالت میں بری الذمہ قرار دے سکے ۔

ڈاکٹر کو زندگی کے لیے قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اگر اُن کو قیمت ادا نہ کی جائے تو وہ آپ کے لیے قبر کا منہ کھول دیتے ہیں یہ ہماری اس سوسائٹی کا المیہ ہے۔غرض محمد حمید شاہد ایک منفرد افسانہ نگار ہیں اور اس کی وجہ سے ان کے افسانوں میں پائے جانے والے موضوعات کو تنوع حاصل ہوا ہے اور یہی تنوع ان کے افسانوں کو خوبصورتی عطا کرتا ہے ۔اگر اسلوب کے حوالے سے دیکھا جائے تو محمد حمید شاہد نے اسلوب کی نئی راہیں دریافت کرنے کی کوشش کی ہے ۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں مقامی اور علاقائی ماحول سے جڑی زبان کو بھی باخوبی استعمال کیا ہے ۔حمید شاہد کے ہاں الفاظ کا ذخیرہ حیرت انگیز طور پر وسیع ہے۔ان کی کہانیوں میں استعمال کی جانے والی زبان داد کی مستحق ہے ۔ کیونکہ اسی سبب سے آپ ان کی کوئی بھی کہانی کو زیر مطالعہ لے آئیں آپ کو اس میں ایک نثری آہنگ نظر آئے گا جو قاری کو آغاز سے انجام تک زنجیر کئے رکھتا ہے ۔مجموعی طور پر محمد حمید شاہد اپنا ایک منفرد اسلوب وضع کرنے میں کامیاب رہے ہیں

محمد حمید شاہد کو ان افسانہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے جو کہانی میں احساس کی موجودگی کے قائل ہیں ۔ ان کے افسانے کسی خاص طبقے یا وقت کے لیے نہیں ہوتے ہوتے بلکہ ان کے افسانے وقت کی قید سے آزاد ہیں

حوالہ جات

۱۔ حمید شاہد،محمد،"حیرت کا باغ /مجموعہ" ،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۲۱ء ص: ۴۳
۲۔ منشا،یاد،دیباچہ ،رنگ رنگ کے رنگ" بندآنکھوں سے پرے"الحمد پبلی کیشنز،لاہور، ۱۹۹٤ء ،ص:۱۲
۳۔ حمید شاہد،محمد،حیرت کا باغ /مجموعہ"سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور، ۲۰۲۱ء،ص: ۲۰۰
٤ ۔ ایضاً،ص: ۱۵۰

۵۔ شمیم حیدر ترمذی،ڈاکٹر،''جنم جنم کی کہانی''مشمولہ''محمد حمید شاہد کی تخلیقی جہات''مرتب اظہر سلیم
مجوکہ،ملتان،بیکن بکس،۲۰۰۲ ء ص: ۴۷
٦۔ منشا ء یاد ،دیباچہ ،رنگ رنگ کے رنگ،''بند آنکھوں سے پرے''الحمد پبلی کیشنز،لاہور ۱۹۹٤ ء ص:۲ ۱
۷۔ حمید شاہد،محمد، ''حیرت کا باغ /مجموعہ'' ،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور ۲۰۲۱ ء ص: ۸۹
۸۔ اصغر عابد ،بند آنکھوں سے پرے،مشمولہ ''محمد حمید شاہد کی تخلیقی جہات'' ص: ۸۹
۹۔ شمیم حیدر ترمذی،ڈاکٹر، ''جنم جنم کی کہانی''مشمولہ ''محمد حمید شاہد کی تخلیقی جہات''مرتب،اظہر سلیم مجوکہ، ملتان بیکن بکس،۲۰۰۲ ء ص: ۴۷
۱۰۔ حمید شاہد،محمد، "حیرت کا باغ /مجموعہ " ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ،۲۰۲۱ ء ص: ۲۲۱
۱۱۔ ایضاً، ص: ۲۲۱
۱۲۔ ایضاً، ص:٥٤٤